تلاش کا جواب

دنیا میں دوسروں سے آگے بڑھنا اور ترقی حاصل کرنا انسانوں کا فطری جذبہ ہے۔اسی جذبے کے تحت لوگ مال و دولت، مقام و مرتبے، علم و ہنر، بنگلہ، گاڑی، صورت اور وجاہت میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑھ بھی جاتے ہیں۔

بلاشبہ دنیا میں نظر آنے والی ساری ترقیاں اسی جذبے کی مرہون منت ہیں۔نت نئے ماڈل کی چمکتی دمکتی گاڑیاں، شاندار بنگلے، عالیشان عمارتیں، بڑی بڑی فیکٹریاں، بہترین تراش خراش اور رنگ کے لباس، حسین و جمیل مرد و زن، وزارتیں اور بادشاہتیں، اقتدار اور حکومت، جبہ و دستار اور علم و فن کی سربلندیاں سب اسی کا نتیجہ ہیں۔دنیا میں پیہم ترقی اور مسلسل بہتری کے پیچھے خوب سے خوب تر کی تلاش کا یہی عامل کارفرما ہے۔

آہ! مگر کیا کیجیے کہ انسانوں کی ان شاندار کامیابیوں کے بیچ خود انسان نہیں ملتے۔جو ملتے ہیں وہ انتہائی سطحی، پست، چارپائے اور جانور کی سطح پر جینے والا ایک دوپایہ ہوتا ہے۔بہترین لباس میں ملبوس، خوشبو لگایا ہوا، نئے ماڈل کی گاڑی سے اترتا ہوا، بظاہر بڑا باوقار بڑا خوش نما دوپایہ دراصل ایک خودغرض، بے حس، مفاد پرست، متعصب اور ہٹ دھرم دوپایہ ہوتا ہے۔

اس پستی اور سطحیت کا سبب صرف یہ ہے کہ اس انسان نے اپنی ترقی کا میدان اپنی شخصیت کو نہیں بنایا۔اس نے اپنے باطن کو چھوڑ کر ظاہر کو خوبصورت بنایا۔اپنی سیرت کو چھوڑ کر صورت پر توجہ دی۔اس نے علم سیکھا مگر تعصّبات سے بلند نہیں ہوا۔وہ شاطر بنا معقول نہیں بن سکا۔اس نے مال کمایا مگر دوسروں پر خرچ کرنے والا نہیں بنا۔وہ مال کی مفلسی سے ڈرا مگر اخلاق کی مفلسی کو عیب نہیں سمجھا۔اس نے دنیا کے مفاد کو دیکھا آخرت کے مفاد کو بھول گیا۔

آج ہر دور سے بڑھ کر خدا کے فرشتے خدا کی جنت کے لیے ایسے لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو مفاد پرست، خواہش پرست، متعصب اور انا پرست نہ ہوں۔کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ دوپایوں کی اس دنیا میں آپ فرشتوں کی تلاش کا جواب بن جائیں۔آپ یہ جواب بن سکتے ہیں اگر آپ اپنی ترقی کا ہدف اپنی شخصیت کو بنالیں۔

خیر خواہی

جسمانی طور پر نابینا ہونا کوئی عیب نہیں، یہ امتحان ہے۔ اصل عیب اندھے پن کی وہ قسم ہے جس میں انسان اپنی ذات، بیوی بچوں، مفادات اور خواہشات کے علاوہ کچھ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے بارے میں سوچتے ہیں کہ اس کے بغیر اس دنیا میں جینا ممکن نہیں۔ مگر ساتھ ساتھ دوسروں کی خیر خواہی کا احساس بھی ان میں زندہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے بھلا کرنے کے لیے دوسروں کا برا نہیں کرتے۔ اپنی خواہشات کے ساتھ دوسروں کی ضروریات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ وہ کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں۔ وہ پہنتے ہیں اور دوسروں کو بھی پہناتے ہیں۔ وہ گاڑی اچھی رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں بٹھا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں سے بغیر مفاد کے مسکرا کر ملتے ہیں۔ بلاسبب ان کی خیر و عافیت معلوم کرتے ہیں۔ کسی کی مصیبت کا علم ہو تو حتی الوسع ان کی مدد کرتے ہیں۔

دوسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جنھیں ہم نے اندھا کہا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی ذات اور مفاد کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔ اپنا مفاد ہو تو وہ آپ سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئیں گے۔ اپنا مفاد ہو تو آپ کے آگے پیچھے پھریں گے۔ یہ نہ ہو تو ایسے اجنبی بن جائیں گے کہ جیسے جانتے نہیں۔ آپ پر کوئی وقت آن پڑے تو آپ کے سائے سے بھی دور بھاگیں گے۔

ایسے لوگ دنیا میں بظاہر بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ گھر، بنگلہ، گاڑی، دفتر غرض ہر چیز میں دوسروں سے آگے۔ مگر کل روز قیامت جب جنت کی نعمتیں ملنا شروع ہوں گی تو ان کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ لیکن وہ لوگ جن کی زندگی دوسروں کی خیر خواہی کی زندگی تھی۔ وہ اللہ کی عطا کو سب سے بڑھ کر پانے والے ہوں گے۔ ان کا محل، ان کی سواری سب سے اعلیٰ ہو گی۔

نگاہِ یار سلامت ہزار مے خانے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آج سے چار ہزار برس پرانا ہے۔ انھوں نے پورے مشرق وسطیٰ کے علاقے میں گھوم کر لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلایا۔ مگر سوائے ان کی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط علیہما السلام کے ان پر کوئی ایمان نہیں لایا۔ پیروکاروں کی تعداد کے لحاظ سے انسانی تاریخ میں کسی مشن کی اس سے بڑی ناکامی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی انبیا و رسل کے مشن بھی ایسی ہی ظاہری ناکامی سے دوچار ہوئے ہیں۔

انبیا کے پاس یہ راستہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے جذبات بھڑکا کر، ان کے تعصّبات ابھار کر اور ان کی خواہشات کی پیروی کر کے لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کریں اور مقبول لیڈر بن جائیں۔ مگر وہ ایسا کبھی نہیں کرتے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کے زمانے میں یہود رومیوں کے خلاف شدید نفرت کا شکار تھے۔ سیاسی آزادی ان کا مشن تھا۔ ظاہری اعمال ان کا اصل دین تھا۔ آنجناب نے ان میں سے ایک چیز کو بھی سند جواز دینے سے انکار کر دیا۔ اس رویے پر شدید تنقید کی یہاں تک کہ یہود آپ کی جان کے درپے ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ حضرات انبیاء کیوں مقبولیت اور لیڈری کا یہ راستہ اختیار نہیں کرتے۔ کیوں وہ لوگوں کی نفرت اور دشمنی کے کانٹے سمیٹتے رہتے ہیں۔ اس کا سادہ ترین جواب یہ ہے کہ ان کی نگاہ اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا اصل مشن لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کرنا نہیں سچائی کی شمع روشن کرنا ہے۔ ان کا مسئلہ مقبولیت نہیں، ہدایت ہوتا ہے۔ ہدایت لوگوں کے جذبات اور خواہشات کا نہیں اللہ کی مرضی کا نام ہے۔ اس راستے پر چل کر لوگ نہیں ملتے تو کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تو مل جاتا ہے۔ جو لوگ مئے توحید کے نشہ سے سرشار ہوں ان کے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی۔

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے

نگاہِ یار سلامت ہزار مے خانے

اللہ کی پناہ

اس دنیا میں انسان ہمیشہ مختلف خطرات کی زد میں رہتا ہے۔ان خطرات سے بچنے کے لیے انسان جتنی بھی کوشش کر لے، بہر حال غفلت یا بے خبری میں انسان کبھی نہ کبھی ان کا نشانہ بن جاتا ہے۔انسان کا یہی وہ عجز ہے جس کی بنا پر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے اپنے پروردگار کی مدد و پناہ حاصل رہے۔قرآن مجید کی آخری دو سورتیں یعنی فلق اور ناس جنھیں ملا کر مُعَوِّذَتَیْنِ کہا جاتا ہے، انسان کے اسی عجز کا جواب ہیں۔

صحیح احادیث کے مطابق جب یہ سورتیں نازل ہوئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبصرہ فرمایا کہ ان جیسی آیات پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں،(مسلم ،رقم 1183-1881)۔آپ کا یہ معمول تھا کہ رات سوتے وقت تین دفعہ سورہ اخلاص کے ساتھ یہ دونوں سورتیں پڑھتے اور دونوں ہاتھوں پر پھونک کر پورے جسم پر پھیر لیتے ،(بخاری ،رقم 5017)۔حفاظت کے پہلو سے ان سورتوں کے اور بھی متعدد فضائل روایات میں بیان ہوئے ہیں۔

جب ان دو سورتوں کے مضامین کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا کہ بلاشبہ ان میں اس اعلیٰ طریقے سے اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہے کہ اس سے بہتر طریقہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا تھا۔یہ حقیقت اس وقت اور واضح ہو جائے گی جب یہ بات سامنے رہے کہ انسانی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ایک جسمانی اور دوسرا نفسیاتی۔پہلی سورت یعنی سورہ فلق انسان کے جسمانی وجود اور دوسری اس کے نفسیاتی وجود کو ہر قسم کے نقصان دہ اثر سے بچاتی ہے۔

پہلی سورت میں ’’رب الفلق‘‘ کی پناہ مانگی گئی ہے۔فلق کا لفظی مطلب پھاڑنا ہوتا ہے۔اس سے عام طور پر صبح مراد لی جاتی ہے۔کیونکہ صبح کے وقت دن کی روشنی تاریکی کے پردے کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔تاہم یہاں ’’رب الفلق‘‘ سے مراد صرف صبح نہیں بلکہ ہر چیز کا پھاڑ کر

نکالنے والا ہے۔ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے لیے فالق الاصباح (الانعام 96) کے الفاظ قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں۔ اور اسی پس منظر میں فالق الحب النویٰ (الانعام 95) کے الفاظ آئے ہیں یعنی دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا۔ مراد اس سے تخلیق کرنا یا پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہر چیز کسی نہ کسی چیز کا پردہ یا خول پھاڑ کر اس طرح نمودار ہوتی ہے کہ ایک وجود دوسرے وجود سے برآمد ہوا صاف محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تمام حیوانات رحم مادر یا انڈے سے اور نباتات گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر نمودار ہوتے ہیں۔ یا پھر جیسے صبح کی مثال گزری جو رات کا پردہ پھاڑ کر نکلتی ہے۔ چنانچہ اسی خالق کا سہارا لے کر تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کو خالق کہنے کے بجائے ''رب الفلق'' کیوں کہا گیا۔ ہمارے نزدیک یہی وہ صفت ہے جس کا سمجھنا پناہ اور تحفظ کی حقیقی نوعیت کو واضح کردیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''رب الفلق'' بول کر یہاں تخلیق کے اس مرحلہ آغاز کو سامنے کردیا گیا ہے جب ایک وجود جسمانی طور پر کمزور ترین حالت میں ہوتا ہے۔

اپنی تخلیق کے ابتدائی مرحلے ہر مخلوق چاہے حیوانات ہوں یا نباتات، انتہائی کمزور ہوتی ہے۔ مگر یہ ''رب الفلق'' ہی ہے جو اس کمزور وجود کا سہارا بنتا ہے۔ وہ ہر خطرے اور اندیشے سے اسے بچا کر وجود کامل بنا دیتا ہے۔ یوں صبح کی سفید دھاری دن کی روشنی میں ڈھل جاتی ہے، ناتواں بچہ مرد کامل بن جاتا ہے وار نرم و لطیف کونپل توانا درخت کا روپ دھار لیتی ہے۔ چنانچہ ایک بندہ مومن کو یہ سکھایا گیا ہے کہ اگر پناہ چاہنی ہے تو اسی ''رب الفلق'' کی چاہو جو ہر ناتواں کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

تمام مخلوقات کے شر سے عمومی پناہ مانگنے کے بعد اس ''رب الفلق'' کی پناہ تین ان مواقع پر مانگی گئی ہے جب انسان اپنی بے خبری کی بنا پر اپنے دفاع کے قابل نہیں ہوتا۔ ایک رات کے

اندھیرے میں جب تاریکی کے ساتھ نیند کی بے ہوشی انسان کو ہر طرح کے خطرات چاہے کیڑا کاٹتا ہو یا چور ڈاکو کے لیے آسان شکار بنا دیتی ہے۔ دوسرا جادو ٹونہ کرنے والوں کے شر سے جو بے خبری میں انسان پر وار کرتے ہیں اور تیسرے اس حاسد کے حسد سے جس کے دل کا حال انسان نہیں جان سکتا۔

یہ انسان کے جسمانی وجود کی حفاظت کا انتظام تھا۔ دوسری سورت یعنی سورہ ناس انسان کے نفسیاتی وجود کا تحفظ کرتی ہے۔ اس تحفظ کی ضرورت دراصل ان وسوسہ انگیزی کے خلاف پڑتی ہے جو شیاطین جن و انس انسان کے دل و دماغ میں کرتے ہیں۔ انسان اس وسوسہ انگیزی، پروپیگنڈے، خیالات اور توہمات سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ وسوسہ ڈالنے والے شیاطین، لیڈر اور ساتھی تو عام طور پر اپنا کام کر کے پیچھے ہو جاتے ہیں اور انسان ان کے اثر سے ایسے کام کرنے لگتا ہے جو اس کی دنیا اور آخرت دونوں کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔

وسوسہ انگیزی کا یہ فتنہ جسمانی ضرر سے اتنا زیادہ سنگین ہوتا ہے کہ ''رب الفلق'' کی ایک صفت کے برعکس یہاں اللہ کی تین صفات یعنی انسانوں کے رب، بادشاہ اور معبود کی پناہ لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ انسان زمانہ قدیم سے تین طاقتور ہستیوں کی انھی تین قسموں سے واقف رہا ہے جو اسے تحفظ دیتی رہی ہیں۔ وہ اگر غلام ہے تو اس کا مالک یا رب معاشرے کے دوسرے لوگوں سے، وہ رعایا ہے تو اس کا بادشاہ دوسرے ملکوں، قوموں اور باشاہوں سے اور بحیثیت ایک بندے کے اس کا معبود اسے ساری مخلوقات کے شر سے بچاتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کے اصل مالک، بادشاہ اور معبود ہیں۔ چنانچہ جب ان کی پناہ مانگی گئی تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے غلام، اپنی رعایا اور اپنے بندے کو بچانے نہ آئیں۔ اور جب وہ بچانے آجائیں تو کسی کی کیا مجال کہ وہ اپنے شر سے ایسے غلام کو نقصان پہنچا سکے۔

الٹا چاند

یہ ایک تجربہ ہے جو قمری مہینے کے بیشتر ایام میں کیا جاسکتا ہے لیکن مہینے کی سات اور اکیس تاریخ اس تجربے کے لیے بہترین ہیں۔ان دو تاریخوں میں چاند بالکل آدھا نظر آ رہا ہوتا ہے۔ سات تاریخ کو آپ آسمان پر نظر ڈالیں اور چاند کو غور سے دیکھیں۔چاند انگریزی زبان کے حرف D کی مانند نظر آئے گا۔یعنی اس آدھے چاند کا روشن حصہ دائیں طرف ہوگا۔یہی تجربہ قمری مہینے کی اکیس تاریخ کو دہرائیں تو اب آپ کو چاند انگریزی حروف تہجی کے C کی مانند نظر آئے گا۔یعنی اس کا روشن حصہ بائیں آ چکا ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہینے کے نئے چاند یا ہلال کے ساتھ جب چاند کا دائرہ بڑھنے لگتا ہے تو اردو کے حرف د سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ پھر بتدریج روشن چاند کا دائرہ داہنی سمت سے بھرتا ہے اور سات تاریخ کو انگریزی کے حرف D کی طرح نصف روشن ہوجاتا ہے۔چودھویں کو چاند مکمل دائرے کی شکل میں بھر جاتا ہے اور اس کے بعد داہنی سمت ہی سے چاند کا روشن حصہ کم ہونے لگتا ہے۔اکیس تاریخ کو یہ حرف C کی طرح آدھا رہ جاتا ہے۔مگر سات تاریخ کے چاند کے برعکس اس آدھے چاند کا پیٹ دائیں کے بجائے بائیں طرف ہوتا ہے۔اور پھر اسی سمت میں یہ کم ہوتا ہوا غائب ہوجاتا ہے۔

اگر آپ زمین کے نصف جنوبی کرے(southern Hemisfhere) کے کسی ملک جیسے آسٹریلیا یا نیوزی لینڈ میں موجود ہیں تو یہ تحریر پڑھتے ہوئے آپ میرے مشاہدے کو بالکل غلط قرار دیں گے۔ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے جھوٹی معلومات فراہم کرنے والا ایک دھوکے باز شخص سمجھیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ آپ میرے بیان کردہ طریقے کے مطابق چاند کو ساتویں اور اکیسویں شب کو دیکھیں گے تو چاند بالکل برعکس جگہ پر ہوگا۔یعنی ساتویں کو وہ C اور اکیسویں کو D کی مانند ہوگا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ بھی ٹھیک ہیں اور میں بھی غلط نہیں۔ میرے جیسے وہ تمام لوگ جو زمین کے شمالی نصف کرے (Northern Hemisphere) پر بستے ہیں، وہ چاند کو ایسا ہی دیکھتے ہیں جیسا میں نے بیان کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چاند زمین کے مرکز یا خط استوا کے گرد گردش کرتا ہے۔ خط استوا (equator) کے شمال میں واقع لوگوں کو وہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے جیسا کہ وہ خط استوا کے جنوب میں واقع لوگوں کو نظر آتا ہے۔ یوں دونوں خطوں کے لوگ ایک ہی حقیقت کو مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔

انسانی زندگی میں جو اختلافات پیش آتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جہاں فرق صحیح اور غلط اور حق و باطل کا ہوتا ہے۔ تاہم اکثر اوقات دونوں فریق اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوتے ہیں۔ لیکن وہ معاملے کو اپنے اپنے زاویے اور اپنے اپنے مقام سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات ایک ہی حقیقت بالکل مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہے۔ یوں اختلاف رائے بلکہ بارہا فساد، لڑائی جھگڑے اور تعلقات کی خرابی کی نوبت آجاتی ہے۔

اس اختلاف کی ایک مثال مسلمان فقہا کے مابین ہونے والا اختلاف رائے ہے۔ یہی معاملہ ساس بہو کے جھگڑے کا ہے۔ اس میں بھی دونوں فریق اکثر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر معاملات کو دیکھتے ہیں اور نتیجے کے طور پر اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے اختلافات کو رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے شخص کا زاویہ نظر سمجھا جائے۔ اگر معاملہ حق و باطل کے بجائے زاویہ نظر کا ہے تو یہ مان لیا جائے کہ اس معاملے میں ایک سے زیادہ رائے قائم کرنا ممکن ہے۔ اگر معاملہ ساس بہو کی طرح عملی نوعیت کا ہے تو پھر زاویہ نظر کے اختلاف کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فریق دوسرے کی رعایت کرے۔ اس سے درگزر کرے۔ یہ نہ ہو سکے تو کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ایسے مسائل حل کیے جاتے ہیں جس میں ہر فریق کچھ نہ کچھ پیچھے ہٹتا ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا راستہ اختلاف کو فساد میں بدل دیتا ہے۔

مکاتیب

ابویحییٰ

ڈاکٹر اسرار مرحوم کے جانشین

محترم المقام حافظ عاکف سعید صاحب 09/11/2014

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

آپ کے زیرِ ادارت چھپنے والے رسالے ماہنامہ میثاق میں محترم پروفیسر عبداللہ شاہین صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''کیا بائبل کا مطالعہ ضروری ہے؟'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اس عاجز کے ایک وضاحتی مکتوب کی تردید میں لکھا گیا ہے جو ماہنامہ انذار میں اگست 2014 میں شائع ہوا۔

میں اس مضمون کے مندرجات پر تبصرے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس خط کا اصل مقصود ایک اہم گزارش پیش خدمت کرنا ہے۔ وہ یہ اگر آپ اور آپ کی تنظیم فاضل مصنف کی اس رائے سے متفق ہیں کہ مسلمان اہل علم کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ قدیم صحف سماوی کا مطالعہ کریں اور قدیم صحف سماوی کی کوئی چیز چاہے وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو اسے نقل نہ کیا جائے تو پھر ایک اہتمام ضرور کرلیجیے۔ وہ یہ کہ مرحوم ڈاکٹر اسرار صاحب کی وہ تمام تقریریں اور تحریریں جن میں قدیم صحف سماوی کے حوالے، بائبل کے حوالے سے بیان کردہ واقعات اور اسرائیلی روایات نیز یہود ونصاریٰ کی تاریخ اور انبیائے سابقہ کی تعلیمات بیان ہوئی ہیں، آپ مہربانی فرما کر تحریر وتقریر کے اس مجموعے سے یہ چیزیں پہلی فرصت میں حذف کروانے کا اہتمام فرمالیجیے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد قول اور فعل کا یہ تضاد اچھا نہیں لگتا۔

اس عاجز کو پندرہ بیس برس تک ڈاکٹر صاحب کی نشستوں میں بیٹھ کر براہ راست یا دوسرے

ذرائع سے ان کی تقریریں سننے اور کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ڈاکٹر صاحب مفسر قرآن تھے۔امم سابقہ کے حالات کا مسلمانوں سے تقابل ان کا خصوصی موضوع رہا ہے۔معمولی علم وعقل کا شخص بھی یہ بات سمجھ سکتا کہ قرآن کی تفسیر کرنے اور امم سابقہ کو اس سطح پر موضوع بنانے والے شخص کے لیے ممکن ہی نہیں کہ کتب سابقہ کے واقعات ، بیانات، حوالہ جات اور تاریخی تفصیلات بیان کیے بغیر گزر جائے۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب ساری زندگی یہ سب کچھ عوام الناس میں بیان کرتے رہے ہیں۔بلکہ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ قدیم صحف سماوی کے بالواسطہ اور بلاواسطہ حوالہ جات جتنے کچھ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی تقریروں اور تحریروں میں ملتے ہیں، تیس چالیس برسوں میں اس کی کوئی مثال کسی دوسرے عالم کے ہاں نہیں ملتی۔

اس بات کو سمجھانے کے لیے مجھے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، اسی شمارے میں جس میں اس خاکسار کو اسی جرم میں ''کچھ زیادہ ہی جدیدیت'' کا مجرم قرار دیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی سورہ کہف کی تفسیر کا ایک جز شائع ہوا ہے۔اس میں واقعہ موسیٰ وخضر علیہما السلام کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

''اس واقعے کا ذکر احادیث میں بھی ملتا ہے اور قدیم اسرائیلی روایات میں بھی، جن میں سے بہت سی روایات قرآن کے بیان سے مطابقت رکھتی ہیں۔بہر حال ان روایات سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کے مطابق......''،(صفحہ 16)

اس مقام پر ڈاکٹر صاحب قدیم صحف سماوی سے آگے بڑھ کر اسرائیلی روایات کی بنیاد پر اس واقعے کی تفصیل بیان کر رہے ہیں۔وقت نہیں ورنہ میں صرف اپنی یادداشت ہی سے درجنوں مثالیں دے سکتا ہوں جن میں ڈاکٹر صاحب نہ صرف کتب سابقہ کے حوالے دیتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو شریعت کے بعض احکام جیسے رجم میں ان کا موقف ہی یہ ہے کہ اس کا ماخذ تورات ہے۔اس فقیر کا

نقطہ نظر اگر ''کچھ زیادہ ہی جدیدیت'' کے زمرے میں آتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کی ''جدیدیت'' کا حدود دوار بعہ تو اتنا پھیلا ہوا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لیے کیا الفاظ استعمال کیے جائیں۔

اس لیے مود بانہ گزارش یہ ہے کہ اس فقیر کو بدنام کرنے کے لیے آپ اور آپ کی تنظیم نے کوئی اصولی فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ تنظیم کے لوگ اس عاجز کی تحریروں پر طبع آزمائی کرتے اور آپ اطمینان سے اپنے رسالے میں اسے شائع کر دیتے ہیں تو مہربانی کر کے کچھ ایسے موضوعات کا انتخاب فرمایئے جن کی زد ڈاکٹر اسرار مرحوم پر نہیں پڑتی ہو۔ پچھلی دفعہ بھی آپ کی تنظیم کے ایک دوسرے صاحب نے بڑی محنت سے میرے خلاف ایک مضمون لکھا۔ مگر جہاں اور بہت سے جھوٹے الزام و بہتان اس تنقید کا حصہ تھے، وہیں وہ یہود کے اس رویے کی حمایت کرتے ہوئے جسے اللہ تعالیٰ سورہ بنی اسرائیل کی ابتدا میں فساد فی الارض کہتے ہیں، ''سپر پاور کی غلامی سے نجات کی غیرت مندانہ جدو جہد'' قرار دے بیٹھے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر ایمان سلب کر دینے والے اس جرم عظیم کی طرف ان کی توجہ دلائی۔ مگر ساتھ میں بڑے ادب سے انھیں یہ بھی بتانا پڑا کہ یہود پہ میری جس تنقید پر آپ اتنے چراغ پا ہو رہے ہیں، اس کی تفصیلات اس عاجز نے بیس پچیس برس قبل ڈاکٹر اسرار مرحوم ہی سے سنی تھیں۔

اس لیے محترم المقام جو مہم چلانی ہے چلایے، جھوٹے الزام و بہتان کے جو تیر برسانے ہیں برسایے، اس لیے کہ یہ عاجز ایسی چیزیوں کو اپنی آخرت کا عظیم سرمایہ سمجھتا ہے، مگر خدارا آئندہ یہ اہتمام ضرور کر لیا کریں کہ اس مہم جوئی کی زد ڈاکٹر اسرار مرحوم پر نہ آتی ہو۔ اس فقیر نے ڈاکٹر صاحب سے بڑا استفادہ کیا ہے۔ اسے ڈاکٹر صاحب کے جانشینوں کے ہاتھوں ان کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر نہ صرف بہت دکھ ہوتا ہے بلکہ ایسے نالائق علمی ورثے کو دیکھ کر دل بھی بہت کڑھتا ہے جو ڈاکٹر صاحب کے نام پر شہرت اور ناموری تو خوب حاصل کر رہے ہیں، مگر

انقلاب کے علاوہ ان کی کسی علمی بات کو سمجھنے کی معمولی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔

ایک آخری درخواست یہ ہے کہ جب کبھی کوئی شخص ڈاکٹر صاحب کو اس وجہ سے مطعون کرنے کی کوشش کرے کہ ان کے ہاں بائبل، اسرائیلی روایات ،قدیم صحف سماوی اور انبیائے سابقہ کا ذکر بہت ہوتا ہے تو اس موضوع پر اس فقیر کے مضامین سے ضرور استفادہ کیجیے گا۔ یہ بہت کام آئیں گے۔اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا دفاع آپ لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔نہ یہ مضمون شائع کر کے آپ اخلاقی طور پر اس قابل رہے ہیں کہ ان کے دفاع میں کچھ کہہ سکیں۔

باقی پروفیسر عبداللہ شاہین سے بہت معذرت کہ میں نے ان کے مضمون پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ انھوں نے اس حوالے سے میرا اصل مضمون پڑھا، نہ اس کے دلائل کو دیکھا، نہ میرے مکتوب کو دیانتداری سے نقل کیا، نہ اس پر کوئی علمی سطح کا تبصرہ کیا۔اس فقیر کے نزدیک غیر متعلق اور غیر مستند چیزوں پر مشتمل کسی تنقید کا جواب دینا اپنے وقت کا زیاں ہے۔خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ اس معاملے سے متعلق واحد روایت جو حضرت عمر کے حوالے سے مشہور ہے، میں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ اس کا ایک راوی متہم بالکذب ہے اور یہ روایت محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ پھر بھی اس روایت کو نقل کر کے جو لوگ جھوٹا پروپیگنڈا کریں ان کو جواب دینا کارلاحاصل ہے۔

کوئی بات گراں خاطر گزری ہو تو اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔

والسلام

بندہ عاجز

ابو یحییٰ

فرح رضوان

بچوں کی تربیت اور ریاکاری

ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن اور حدیث میں ایسے شخص کو جو محض لوگوں میں اپنی ناموری اور دھاک بٹھانے کے لیے اللہ کی راہ میں کوئی کام کرتا ہے اسے ریاکار کہا گیا ہے، اب خواہ وہ شہید ہو، یا سخی یا عالم جنہوں نے بھی دنیا کی واہ واہ لوٹنے کی خاطر کوئی کام کیا ہوگا ان سے کہا جائے گا کہ تم نے جو چاہا وہ تم نے دنیا میں پالیا اور انہیں مونہہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ مرض انسان کے دل میں نہایت خاموشی اور غیر محسوس طور پر داخل ہوتا ہے، جیسے کہ کوئی کالی چیونٹی، کالی سیاہ رات میں، سیاہ پتوں سے ڈھکے کسی کالے پتھر پر چلے تو نہ کسی انسان کو وہ دکھائی دے گی نہ سنائی۔

سوال یہ ہے کہ ریا کا یہ وائرس انسان کے دل میں داخل کس طرح ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ گل خود پسندی کی کیاری میں کھلتا ہے جس کی آبیاری ایک انسان کے بچپن میں اس کے والدین اور گھر کے بزرگ حوصلہ افزائی اور خوداعتمادی کے نام پر کرتے ہیں۔ مانا کہ کسی حد تک تحسین وحوصلہ افزائی دونوں ہی ضروری ہیں لیکن سوال یہی ہے کہ کس حد تک؟ گزشتہ ادوار میں تو صرف یہی ہوتا کہ کسی اچھے کام پر اسکول، محلے یا خاندان کے افراد کے سامنے ہی کم یا زیادہ واہ واہ ہو جاتی، لیکن اب تو عالم یہ ہے کہ لباس ہو یا خوراک، ملنا جلنا، جھولنا اچھلنا کودنا تمام تر کارگزاریوں کی pix یا vids والدین سوشل میڈیا پر اپلوڈ کرتے ہیں اور پھر تین سے چھ سال تک کے معصوم بچوں کو خوش ہو ہو کر انہیں پیار کر کر کے بتایا جاتا ہے کہ اس کے کپڑوں پر، برتھ ڈے پر، رزلٹ پر، بیماری پر، حادثے پر، اداؤں پر کس کس نے کیا کیا کمنٹس دیے ہیں کتنا لائک کیا ہے، اس سے بڑی عمر کے بچے تو نہ صرف خود ہی پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں بلکہ ان کو داد و

تحسین لوٹنے کا ہنر بھی آ جاتا ہے۔

اب ایک ایسا معصوم ذہن یہ ماحول اور عادات لے کر جب بڑا ہوگا تب اسے کتنا ہی سمجھایا جائے گا کہ بیٹا ایک مسلمان کی نماز، قربانی، جینا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے تو کیا اس کا نفس اس ''ہی'' کو بآسانی ''بھی'' میں تبدیل نہیں کردے گا؟ اسے اللہ کے لیے ہی میں اخلاص، اور اللہ کے لیے بھی، میں شرک خفی کس طرح دکھائی دے سکے گا؟ اس مائنڈ سیٹ کے انسان کے لیے قیامت کا ازلی خسارہ تو ہے ہی، فی الحال مختصراً یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اس راہ کے مسافر کے سنگ میل کیا ہیں اور کون سی منزل اس کی منتظر رہتی ہے۔

ایک مسلمان پر آزمائش کسی بھی شکل میں آ سکتی ہے، حالات بہترین ہیں تو اس کا شکر، لیکن کبھی اللہ کی رضا کی خاطر جھکنا بھی پڑتا ہے، ٹوٹنا بھی مر مٹنا بھی، تب ایسی نفسیات کے حامل افراد، ایک قناعت پسند مسلم کی طرح الحمدللہ علی کل حال کی سوچ کو، چھو بھی نہیں پاتے، اور اپنے دکھوں, قربانیوں, تکلیفوں کے اشتہار لگا بیٹھتے ہیں۔ نادان دوست تو ویسے ہی ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں سو ان کی بے جا ہمدردیوں اور غیر مفید مشوروں کا فیول لینے کے بعد اس پلیٹ فارم سے ان کی زندگی کی گاڑی خود پسندی کی پٹڑی بدلتی خود ترسی یعنی سیلف پٹی کی ڈگر پر چل پڑتی ہے، اور یہ وہ راستہ ہے جہاں مسلمان ہوتے ہوئے بھی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا پر سے غیر محسوس طور پر ان کا یقین اٹھ جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ اپنے دکھوں کا مداوا اور دکھ دینے والوں کی سزا اسی دنیا میں دیکھنے کی چاہت اس قدر شدت اختیار کر لیتی ہے کہ یہ ان کی انا کا مسلہ بن جاتا ہے اور یہ egomania یعنی abnormal egotism کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ جذباتی یا نفسیاتی کیفیت غیر محسوس طور پر تکبر میں مبتلا کر ڈالتی ہے، جس سے ''میں'' جنم لیتی ہے، اور ایسا ہو نہیں سکتا کہ اس کے بعد انسان کی زبان شیریں رہ پائے، اور زبان کی

خرابی کے بعد دوسروں سے تعلقات، درست رہ پائیں۔لوگوں کی دوری، شدید ذہنی دباؤ کا باعث بن جاتی ہے اور دیگر جسمانی امراض کے ساتھ اکثر ایسے افراد illusions کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس صورتحال میں میں قصوروار کیا صرف ایک ہی شخصیت ہوگی؟ ہمیں سخت ضرورت ہے کہ سفید سے اورنج ہوتی ستائش و تحسین کی لائن پر کڑی نظر رکھیں اور اورنج سے قبل yellow line پر نہ صرف خود کو روک لیں بلکہ سفید لائن پر واپس آ جائیں۔اور اس ریورس گیئر کو لگانے کا طریقہ بزرگ یہ بتاتے ہیں کہ جب انسان اللہ کے لیے کوئی کام کرے اور اس کا نفس اسے اس بات پر اکسائے کہ کاش لوگ بھی اسے ایسا کرتے دیکھیں تو کتنا سراہیں , تب دعا کے ساتھ ہی یہ تصور بھی کرے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بے شمار فرشتے نہ صرف اسے دیکھ رہے ہیں بلکہ اس کے گواہ ہونگے۔اور آج تو گنتی کے کچھ لوگ ذرا سی شاباش ہی دے پائیں گے،لیکن قیامت کے روز تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ ان گنت ملائکہ اور انسانوں کے سامنے اسے اس کے، چھپے ہوئے نیک کاموں پر اکرام وانعام سبھی کچھ سوچ سے بڑھ کر ملے گا۔

سوال وجواب

ابویحییٰ

کیا حضرت مریم نے غلط بیانی کی تھی؟

سوال: السلام علیکم

سر میرا سوال سورۂ مریم کی آیات ۶۲ سے متعلق ہے، جسکا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''اب چین سے کھا پی اور آنکھیں ٹھنڈی رکھ، اگر تجھے کوئی انسان نظر پڑ جائے تو کہہ دینا کہ میں نے اللہ رحمٰن کے نام کا روزہ مان رکھا ہے۔ میں آج کسی شخص سے بات نہ کروں گی۔''

میرا سوال یہ ہے کہ کیا اللہ نے حضرت مریم کو جھوٹ بولنے کی اجازت دی؟ سر برائے مہربانی میری رہنمائی فرمائیں، ضرور مجھ سے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے، شکریہ

عرفان رشید

جواب: جی یہ جھوٹ نہ تھا۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ سیدہ کی برأت ان کے نومولود بچے کو کرنی تھی، انھیں نہیں۔ چنانچہ ان کو روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا کہ روزہ رکھ لو اور کوئی کچھ سوال کرے تو اشارے سے بتادو کہ تم نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ اس پہلو سے آپ دیکھیں گے تو اندازہ ہو جائے گا کہ سیدہ کو جھوٹ بولنے کے لیے نہیں کہا گیا تھا بلکہ روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ ان کو اپنی صفائی نہ دینی پڑے۔ یہاں یہ بھی خیال نہ کیجیے گا کہ سیدہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کے بعد نفاس کی جس حالت میں تھیں اس میں کوئی خاتون روزہ کیسے رکھ سکتی ہے۔ چپ کے اس روزے کے قوانین دین یہودیت میں جدا بیان ہوئے ہیں۔ اس طرح کے روزے یہودی شریعت میں عام تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے اشارے سے لوگوں کو یہ بتایا تو کسی نے یہ نہیں کہا یہ کس قسم کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

بیوی اور اولاد کی دشمنی

سوال: مہربانی کر کے سورہ تغابن کی اس آیت کی وضاحت کر دیں۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ وَإِن تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (تغابن:14)

ترجمہ: مومنو! تمہاری عورتیں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔اور اگر معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو خدا بھی بخشنے والا مہربان ہے۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (تغابن: 15)

ترجمہ: تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہے۔اور خدا کے ہاں بڑا اجر ہے۔

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس آیت کو اس کے سیاق وسباق اور مرکزی مضمون کی روشنی میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ عمومی طور پر بیوی یا اولاد کے متعلق کوئی فیصلہ کن بیان نہیں کہ وہ دشمن ہی ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک خاص صورتحال کی طرف اشارہ ہے۔یعنی جب بیوی اور اولاد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اس کے تقاضوں کی راہ میں روڑے اٹکانے لگیں تب اس کا اطلاق اس پر ہوگا۔یعنی راہ خدا میں کوئی مصیبت آئے تو اس پر پچھتاوے دلائیں کہ ہم نے منع کیا تھا پھر بھی نیکی کا کام کیوں کیا۔یا انفاق سے روکنے لگیں۔تو ایسے میں بیوی اور اولاد دراصل دشمنی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ اسی صورتحال کی طرف اشارہ ہے اور اسی حوالے سے کچھ پاکیزہ نصیحتیں کی گئی ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ مال واولاد اس دنیا میں آزائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔اپنی ذات

میں مقصد نہیں۔ مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ مال و اولاد اگر اسی اصل مقصد کی راہ میں رکاوٹ بننے لگیں تو باعتبارِ نتیجہ وہ اپنے اور اس شخص کے ساتھ دشمنی کر رہے ہوتے ہیں۔

قوت برداشت اور دین کی دعوت

سوال: السلام علیکم

سر کیا کوئی ایسا شخص جس میں قوتِ برداشت نہ ہو، وہ دین کا داعی بن سکتا ہے؟ اگر اسے کوئی ایسی بات کہہ دے جو اس کو ناگوار گزرے مگر وہ تحمل سے کام لینے کی بجائے اپنے مخالف کو بھی کھری کھری سنا دے تو ایسا شخص خود کو عالمِ دین تو نہیں کہلوا سکتا۔ جب بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں، اور گردن کی رگیں تن جائیں اور نہ اس کے جذبات قابو میں رہیں نہ دلِ و دماغ، ایسا آدمی دین کی تبلیغ کیسے کر سکتا ہے۔ کیا ایک سچا داعی بھی غصہ کر سکتا ہے؟

سر ایسے ہی کل ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے مسجد میں ایک واقعہ رونما ہوا، نماز عید کے وقت کو تعین کرتے ہوئے کسی بات پر ان دو آدمیوں کی آپس میں تکرار ہو گئی، پہلے تو بات نرمی کے ساتھ ہوتی رہی مگر پھر بات میں غصہ آنے لگا، بات بڑھتی گئی اور آخر کار ان دونوں نے ایک دوسرے کو گالیوں سے بھی نوازا اور ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی بے ہودہ زبان بھی استعمال کی، بس ہاتھا پائی کی نوبت آنے والی تھی کہ لوگوں نے پھر بیچ بچاؤ کروا دیا۔ سر مجھے مسجد میں بیٹھ کر اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے پر شرم محسوس ہونے لگی، کہ ہم خود کو اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی کہتے ہیں جن کا اخلاق قرآن ہے۔ اور گالیاں دینے والے بھی وہ جنہوں نے داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں اور پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ مسجد کا تقدس بھی پامال کیا اور جو نمازی تھے ان کے خشوع خضوع کو بھی۔ سر ہم میں برداشت، تحمل اور بردباری، درگزر کیوں ناپید ہو گئی ہے۔ کیوں ہم

درگزر نہیں کرتے۔ یا صرف معاشرے میں انار کی پھیلا نا ہی جانتے ہیں، صبر و تحمل ہے ہی نہیں ہم میں۔ والسلام

محمد اسد

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

جی آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔ ایک داعی اور عالم کو صبر کرنا چاہیے۔ یہ صبر یکطرفہ طور پر کرنا چاہیے۔ بعض اوقات شیطان یہ کرتا ہے کہ جواب دینے اور مخاطب کو شکست دینے کو ایک دینی عمل بنا کر پیش کرتا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات خاموش ہو جانا اور وقتی شکست قبول کر لینا حکمت کے لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ داعی کو ایک دفعہ بات سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن جب یہ واضح ہو جائے کہ سامنے والے کا مقصد صرف بحث و مباحثہ ہے۔ وہ اصلاح نہیں چاہتا۔ وہ کچھ سمجھنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ وہ منفی انداز فکر کا بھی شکار ہے۔ وہ عقلی استدلال کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ اخلاقی معیارات کو پامال کر کے گفتگو کر رہا ہو۔ وہ بدترین بدگمانی، ہر چیز کا غلط مطلب نکالنے، چیزوں کو تاویل کر کے کچھ سے کچھ کرنے اور اعتراف نہ کرنے کی نفسیات میں مبتلا ہو۔ تو قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ایسے تمام مواقع پر سلام کر کے رخصت ہو جانا چاہیے۔ باقی ہم میں صبر اس لیے ختم ہو گیا ہے کہ ہماری قوم میں غم پر تو صبر کی تلقین کی جاتی ہے، مگر دوسروں کی زیادتی کے جواب میں صبر کے بجائے منہ توڑ جواب دینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہ ہمارا مجموعی قومی رویہ ہے۔ نفرت، غصہ اور مردہ باد کے ماحول میں صبر درگزر، برداشت اور تحمل کیسے پھیلے گا۔ اس تربیت کے ساتھ تو پھر اسی قسم کے واقعات جنم لیں گے جن کا آپ نے ذکر فرمایا ہے۔

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

شیعہ سنی جھگڑے کا حل

محترم قارئین! پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کی کئی جہتیں ہیں۔ ان میں سے ایک اہم جہت شیعہ سنی جھگڑے کے پس منظر میں ہونے والی قتل و غارت گری ہے۔ چنانچہ آئے دن اس حوالے سے کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی ہے اور عوام الناس کے ساتھ اہل علم بھی اس کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ خاص کر محرم کے مہینے میں تو اس حوالے سے خوف و دہشت کی ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ نجانے اب کیا ہوگا۔ اس حوالے سے کیے جانے والے حفاظتی اقدامات کے نتیجے میں عملی طور پر بڑے شہروں کی زندگی معطل ہو جاتی ہے۔ برسہا برس گزر گئے ہیں کہ اس صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی بلکہ اب تو مڈل ایسٹ میں رونما ہونے والے واقعات کے حوالے سے یہ ایک بین االاقوامی نوعیت کا مسئلہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ اب دنیا مشرق وسطیٰ کو فلسطین کے مسئلے کے حوالے سے کم اور اس حوالے سے زیادہ جاننے لگی ہے۔

اس صورتحال میں ہم سب کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لیے سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ میں نے اس حوالے سے کئی برس قبل ایک مضمون میں اس مسئلے کا ایک حل تجویز کیا تھا۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا یہ واحد ممکنہ حل ہے۔ جب یہ مضمون شائع ہوا تو معروف شیعہ عالم علامہ ڈاکٹر محسن نقوی صاحب کو کچھ غلط فہمی لگی اور اس پر انھوں نے مجھے ایک ای میل لکھا۔ میں نے ایک خط میں اپنی بات کو مزید واضح کر کے بیان کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ یہ معقول بات مان لی جائے گی۔ یہ بات پرانی ہوگئی مگر پچھلے دنوں ڈاکٹر زبیر احمد صاحب جو کہ ٹی وی کے معروف اینکر ہیں، انھوں نے ایک ملاقات میں مجھے یہ بتایا کہ علامہ صاحب نے ملک کے ممتاز علماء کی ایک

کانفرنس میں شیعہ سنی مسئلے کے حل کے لیے وہی تجویز پیش کی جو میں نے پیش کی تھی۔ یہ میرے خط لکھنے کے بعد ہی کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر زبیر صاحب نے مزید بتایا کہ اس پر ممتاز اہل حدیث عالم دین ابتسام الٰہی ظہیر نے یہ کہہ کر اس تجویز کی تائید کی کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ میرے والد کون تھے (یعنی علامہ احسان الٰہی ظہیر جن کی زندگی کا بڑا حصہ اہل تشیعہ حضرات کے نقطہ نظر کے خلاف جدوجہد میں گزرا اور 1988 میں ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے ایک بم دھماکے میں ان کی رحلت ہوئی) مگر اس کے باوجود میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ بدقسمتی سے بعض دیگر اہل علم کی تائید نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ تاہم اگر ایک بات معقول ہے تو اسے سامنے آنا چاہیے تاکہ اس مسئلے کے حل کی سمت کوئی قدم تو بڑھے۔ ورنہ یہ آگ نجانے کتنے گھر اور اجاڑے گا اور کتنے معصوم لوگ اور اہل علم اس کا نشانہ بنیں گے۔

میں اس تجویز کا خلاصہ پیش کر دیتا ہوں اور پھر اس کے بعد تفصیل کے لیے اپنا مضمون اور پھر علامہ محسن کو لکھا گیا اپنا ای میل بھی نقل کر دوں گا۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس حوالے سے بنائے فساد دو چیزیں بن رہی ہیں۔ ایک اہل تشیعہ حضرات کی طرف سے اور ایک اہل سنت کی طرف سے۔ اہل تشیعہ کی طرف سے صحابہ کرام پر کیا جانے والا سب وشتم جسے اصطلاحاً تبرا کہا جاتا ہے ایک خوفناک ردعمل کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ اہل تشیعہ علما کو یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی اساس تبرائی سوچ کے بجائے تولائی سوچ پر رکھیں گے۔ یعنی صحابہ کرام سے نفرت کے بجائے اہل بیت کی محبت کی بنیاد پر اپنے لوگوں کی تربیت کریں۔

جبکہ دوسری طرف کے علما کو تکفیری سوچ کی حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ اپنے لوگوں کو یہ بتانا ہوگا کہ کسی کے عقیدے کی بنیاد پر اسے کافر قرار دے کر قتل کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمائش کے اصول پر پیدا کی ہے اور لوگوں کو مکمل آزادی دی ہے کہ وہ

جو چاہیں عقیدہ اختیار کریں۔ یہ اللہ کا ہی حق ہے کہ وہ چاہے تو کسی کو اس کے غلط عقیدے کی بنیاد پر سزا دے۔ یہ دروازہ ختم نبوت کے بعد بند ہو چکا ہے۔اب یہ حق کسی صورت کسی انسان کو نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ایمان اور کفر کا فیصلہ کرے اور اس بنیاد پر قتل کر دے۔ یہ بدترین ظلم اور سرکشی ہے۔

اسلام میں اگر کسی جرم پر سزائے موت دی گئی ہے تو اس کو نافذ کرنے کا حق بھی صرف اور صرف ریاست کے پاس ہے۔عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلتا ہے۔ملزم پر جرم ثابت کیا جاتا ہے۔ملزم کو صفائی کا مکمل موقع دیا جاتا ہے۔ اسلام میں اس بات کا کوئی سوال ہی نہیں کہ خدائی فوجداروں کا کوئی گروہ کسی کے عقیدے کی بنیاد پر اس کے قتل کا فیصلہ کر لے اور اس کی جان مال آبرو کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچائے۔

جب دونوں طرف سے یہ بات بار بار اپنے لوگوں کے سامنے رکھی جائے گی تو اختلاف ختم ہو نہ ہو فساد ضرور ختم ہو جائے گا۔ یہی اصل مطلوب ہے۔ رہا نقطہ نظر کا اختلاف تو علمی سطح پر یہ گفتگو جاری رہنی چاہیے۔اصل فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خود کر دیں گے۔

اس تمہید کے بات میں وہ مضمون آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو میں نے 2007 میں لکھا تھا۔ یہ مضمون جو ''نئی امریکی سازش یا پرانا مسلم تنازعہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا، درج ذیل ہے۔

نئی امریکی سازش یا پرانا مسلم تنازعہ

آج کل ہمارے ہاں ایک نئی امریکی سازش کا بڑا تذکرہ ہے۔ یہ سازش مشہور امریکی تھنک ٹینک رینڈ کارپوریشن کے اس نظریے پر مبنی قرار دی جا رہی ہے جس میں مشرق وسطیٰ کو سنی اور شیعہ بلاکوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔اس نظریے کے مطابق ایرانی قیادت میں عراق، بحرین، لبنان اور شام پر مشتمل ایک شیعہ بلاک ہونا چاہیے۔جبکہ اس کے بالمقابل سنی بلاک سعودی عرب کی قیادت

میں وجود میں آئے گا۔

نظریہ سازش کے علمبرداروں کے نزدیک اس منصوبے پر عملدرآمد سے امریکہ اوراسرائیل کومتعدد فوائد حاصل ہوں گے۔ایک یہ کہ مسلم دنیا جو اسرائیل کی مخالفت میں یکسو تھی، آپس کے تنازعات میں الجھ جائے گی۔خاص کر عرب دنیا کی توجہ اپنے بدترین حریف اسرائیل کے بجائے، ایٹم بم سے مسلح شیعہ خطرے کی طرف ہوجائے گی۔پھر اس خطرے کی بنا پر ایران کو ایٹم بم کے حصول سے روکنے کی جو کوششیں امریکہ اور مغربی ممالک کررہے ہیں، انہیں عرب اقوام کی بھرپور حمایت حاصل ہوجائے گی۔ تیسرے اسلامی انتہا پسندوں کا رخ جو اس وقت امریکہ کی طرف ہے، وہ اس نئے تنازع کی طرف ہوجائے گا۔شیعہ انتہا پسند اور سنی انتہا پسند دونوں امریکہ اور اسرائیل کو چھوڑ کر آپس میں سر ٹکرانا شروع کردیں گے۔عراق میں جاری شیعہ سنی حملے پورے عالم اسلام کی جنگ بن جائیں گے۔خاص کر پاکستان میں جہاں شیعہ بڑی تعداد میں موجود ہیں، شیعہ سنی فسادات کی لہر اس طاقتور ملک کو کمزور کرنے میں بہت معاون ثابت ہوگی۔پھر یہ بات بھی لازمی ہے کہ ایران ان فسادات میں پاکستانی معاملات میں مداخلت کرے گا، اس لیے پاکستان سے اس کے تعلقات خراب ہوجائیں گے۔یوں ایران بیک وقت دو خطرات میں گھر جائے گا، جس کے ایک طرف عرب دنیا ہوگی اور دوسری طرف ایٹمی پاکستان۔ چنانچہ اس کی توجہ اسرائیل سے ہٹ جائے گی۔ان تمام حالات میں امریکہ نہ صرف باعزت طور پر عراق سے نکل چکا ہوگا، بلکہ اسے مسلم انتہا پسندوں کے خطرے سے نجات مل جائے گی، جو آپس ہی میں لڑ مر کر ختم ہوجائیں گے۔اسی طرح اسرائیل کو بھی عرب اور ایران خطرے سے نجات مل جائے گی اور اس کے مقابلے پر تنہا فلسطینی رہ جائیں گے۔جن پر اپنی مرضی کا کوئی بھی حل مسلط کیا جاسکتا ہے۔

رینڈ کارپوریشن کی اس تھیوری اور اس مبینہ سازش کے بارے میں کچھ دیر کے لیے فرض کرلیا جائے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، تو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عالم اسلام کے لیے آنے والے دنوں میں کتنے سنگین مسائل پیدا ہونے والے ہیں۔تاہم غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس چیز کو ہم لوگ

امریکی سازش قرار دے رہے ہیں کیا وہ واقعی کوئی امریکی سازش ہے یا ہماری اپنی ہی کوئی کمزوری ہے، جس نے صدیوں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ابتدا ہی سے شیعہ سنی تقسیم کے بہت سے نقصانات دیکھ چکے ہیں۔ موجودہ دور میں انتہا پسندی کے رجحانات نے اس تقسیم کی شدت کو مزید ہوا دی ہے۔ خاص کر اختلافی نقطہ نظر رکھنے والوں کو کافر اور واجب القتل قرار دینے کی روش نے صورتحال کی سنگینی کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ پھر جدید ذرائع ابلاغ کی وجہ سے دوسرے نقطہ نظر کی محترم شخصیات کے بارے میں منفی نوعیت کی تقاریر اور تحریروں کا عام ہو جانا بھی معاملے کو سنگین بنا دیتا ہے۔

ہمیں اگر کسی مبینہ 'امریکی سازش' کا توڑ کرنا ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ہم ہر جگہ امریکہ کو برا بھلا کہتے رہیں۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی تعمیر کریں اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً شیعہ سنی اختلاف کے نقصانات سے بچنے کے لیے ہمیں یہودیوں اور مسیحیوں سے سبق لینا چاہیے۔ دور جدید میں مسیحیت کے مختلف فرقوں اور ان سے بڑھ کر یہودیوں اور مسیحیوں نے اپنے اپنے اختلافات کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ حالانکہ ان کی تاریخ میں پیدا ہونے والے اختلافات کہیں زیادہ سنگین نوعیت کے تھے۔

مسیحی جس ہستی کو، معاذ اللہ، خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، یہودی اس ہستی کے قتل کی ذمہ داری قبول کرتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ ہستی ایک جادوگر کی تھی۔ مگر اب دونوں نے اپنا نقطہ نظر بدل لیا ہے۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک معلم اور استاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ جبکہ مسیحی لیڈر شپ یہودیوں کے بجائے، رومی حکومت کو اس عمل کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے، جس نے (ان کے خیال کے مطابق) مسیح کو صلیب دی تھی۔

مسلمانوں کے لیے بھی اپنے اختلافات کو ختم کرنے کا راستہ یہ نہیں کہ شیعہ سنی اتحاد کی باتیں کی جائیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ چند چیزیں مان لی جائیں۔ ایک یہ کہ شیعہ سنی اختلافات کو بس ایک علمی

بحث تک محدود رکھا جائے اور کفر وقتل کے فتوے دینے بند کر دینے چاہییں۔اس معاملے میں تمام لوگوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ تحمل اور رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔دوسرے صحابہ کرام اور امہات المومنین کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہوں۔اس معاملے میں شیعہ لیڈر شپ کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے کیونکہ ان کی مذہبی قیادت نہ صرف بہت منظّم ہے بلکہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ان ہی کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ شیعہ حضرات میں سے وہ لوگ آگے بڑھیں جو تبرائی (صحابہ کرام کو برا بھلا کہنے کا طریقہ) کے بجائے تولائی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے خاندان سے محبت کا طریقہ) فکر کے حامی ہوں۔اس طرز عمل کے نتیجے میں دونوں فرقوں کے اختلافات جذباتی کے بجائے علمی نوعیت کے رہ جائیں گے۔اور اس طرح اختلافات تو جب تک دنیا قائم ہے، باقی رہیں گے۔ان سے دلوں میں نفرت نہیں پیدا ہوگی۔

باقی جہاں تک امریکہ اور اس کی مبینہ سازشوں کا تعلق ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں ہر سپر پاور اپنے معاملات اسی اصول پر چلاتی ہے۔یعنی دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو دور کریں۔یہ امریکہ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ہماری کمزوریوں سے فائدہ نہ اٹھائے۔

میرا خط

میرے اس ای میل کے جواب میں علامہ محسن نقوی نے مجھے انگریزی میں ایک خط لکھا۔نجانے انھیں یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ میں نے اس مسئلے کی ساری ذمہ داری اہل تشیعہ پر ڈال دی۔اسی کی وضاحت میں میں نے ان کو درج ذیل خط لکھا تھا۔

میرے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ علامہ محسن نقوی جیسے عالم وفاضل شخص نے میرے مضمون پر اظہار کیا۔اپنے مضمون میں انہوں نے تفصیلی طور پر اپنا نقطہ نظر پیش فرمایا ہے۔مجھے مزید خوشی ہوتی

اگر علامہ موصوف میری کسی بات پر نقد کرتے ، مگر بدقسمتی سے انھوں نے میرے پورے مضمون کے جواب میں بمشکل ایک آدھ جملہ ہی لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ میری تحریر کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے مجھ پر اس کا جواب دینے ہی کی ذمہ داری ہے اور وہی میں کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس عمل میں میری بات مزید واضح ہو جائے۔ لیکن اس سے قبل قارئین کی سہولت کے لیے میں وہ پیرا گراف نقل کر دیتا ہوں جس کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے ۔ میں نے عرض کیا تھا:

''مسلمانوں کے لیے بھی اپنے اختلافات کو ختم کرنے کا راستہ یہ نہیں کہ شیعہ سنی اتحاد کی باتیں کی جائیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ چند چیزیں مان لی جائیں۔ ایک یہ کہ شیعہ سنی اختلافات کو بس ایک علمی بحث تک محدود رکھا جائے اور کفر و قتل کے فتوے دینے بند کر دینے چاہییں۔ اس معاملے میں تمام لوگوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ تحمل اور رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔ دوسرے صحابہ کرام اور امہات المومنین کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہوں۔ اس معاملے میں شیعہ لیڈر شپ کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے کیونکہ ان کی مذہبی قیادت نہ صرف بہت منظّم ہے بلکہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ان ہی کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔''

اس پیرا گراف میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ قتل و تکفیر کے فتوے بند ہونے چاہییں۔ دوسرے یہ کہ صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کے بارے میں منفی اندازِ گفتگو ختم ہونا چاہیے۔

اب دیکھیے کہ اس کے جواب میں علامہ موصوف کیا فرماتے ہیں:

"Obviously, the passage is written by a well-meaning Sunni. And the first thing he has done is BLAME THE OTHER SIDE."

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بات ایک سنی کی طرف سے لکھی گئی ہے اور پہلا کام جو اس نے کیا وہ دوسرے پر الزام لگانا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے پورا مضمون اس مفروضے پر لکھا ہے کہ میں نے اہل تشیع حضرات پر قتل و غارتگری کا الزام لگایا ہے اور اہل سنت کو اس سے بالکل بری قرار دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ حضرت علامہ نے یہ بات کہاں سے اخذ کر لی۔ میں نے ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ البتہ جو بات میں نے کہی ہے اور جس پر حضرت علامہ نے ایک لفظ نہیں لکھا وہ صحابہ کرام

ؓ اور امہات المومنینؓ کے بارے میں جذبات برانگیختہ کردینے والی گفتگو ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ اگر علامہ صاحب میری اس بات کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمائیں کہ یہ سب تمھارا وہم ہے۔ شیعہ حضرات تو ان محترم ہستیوں سے بڑی عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔

بہرحال ہر پڑھا لکھا بلکہ اب تو بغیر پڑھا لکھا شخص بھی جانتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ میرے نزدیک اس مسئلے کو حل کئے بغیر شیعہ سنی اتحاد کی باتیں کرنا ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر کبھی نہیں نکل سکتی اور نہ متشددانہ تصادم کو روکا جا سکتا ہے۔ کیا شیعہ حضرات کسی ایسے گروہ کو معاف کر سکتے ہیں جو سیدنا علیؓ اور حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے بارے میں گستاخانہ کلام کرے۔ پھر اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے۔ اسی پس منظر میں یہودی مسیحی مسئلے کے حل سے رہنمائی لینے کا فارمولا میں نے پیش کیا تھا۔

علامہ صاحب نے اپنے طور پر اس مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

"The basic instrument for bringing peace and harmony in a divided community is FOR EACH SIDE TO UNDERSTAND THE POINT-OF-VIEW OF THE OTHER SIDE."

ایک تقسیم شدہ امت میں امن اور ہم آہنگی بحال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر گروہ دوسرے گروہ کے نقطہ نظر کو سمجھے

یہ بات کہ ہر گروہ دوسرے گروہ کے نقطہ نظر کو سمجھے بڑی اہم ہے، مگر اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اصل مسئلے کو سمجھا جائے۔ شیعہ سنی اختلاف کو فساد اور امت کی تباہی میں بدلنے والا عنصر عقیدہ اور نقطہ نظر کا اختلاف نہیں بلکہ بعض محترم ترین شخصیات کے خلاف اختیار کیا جانے والا لب ولہجہ ہے۔ اس کے بعد اب دونوں طرف کا نقطۂ نظر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرز عمل صرف ایک طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھی کو کہا جائے کہ آپ کسی طرح اس چیز سے بچیں۔ اگر شیعہ حضرات یہ چھوڑ دیں تو پھر کسی کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ وہ جلتی پر پنکھا جھلے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ پنکھے کی ہوا سے نہیں بلکہ اس پٹرول سے پیدا ہوتا ہے جو صرف ایک فریق کے پاس ہے۔

ہوسکتا ہے کہ علامہ صاحب یہ فرمائیں کہ شیعہ حضرات کے پاس اپنے اس طرز عمل کا علمی اور تاریخی

جواز ہے۔ ایسے میں ہم ان سے یہ دریافت کریں گے کہ کوئی گروہ اگر سیدنا علیؓ کے خلاف کسی علمی اور تاریخی دلیل کی بنیاد پر یہ لب ولہجہ اختیار کرلے تو کیا وہ اس جواز کو سند قبولیت عطا فرما کر آنجنابؓ کی بارگاہ میں کسی گستاخی کو ایک لمحے کے لیے بھی قبول کر سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر وہ بتائیں کہ انہیں میرے دیے ہوئے حل کے سوا کون سا دوسرا قابل عمل حل نظر آتا ہے جس میں کسی شیعہ کو کافر قرار دینے یا مارنے کی بات نہیں کی جارہی بلکہ اپنی بنیاد صحابہ کرامؓ کی نفرت کے بجائے آل فاطمہؓ کی محبت کی بنیاد پر استوار کرنے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔

امید ہے کہ حضرت علامہ میری معروضات پر ایک ''مسلمان'' بن کر غور فرمائیں گے۔ یہ آخری بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ انہوں نے مجھے ایک well-meaning سنی قرار دیا ہے۔ میرے well-meaning ہونے (یعنی وہ شخص جو مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں مسئلہ اور خراب کر دے) کا فیصلہ تو قارئین بہتر طور پر کر سکتے ہیں، البتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مسلمان امتی ہونے کے علاوہ اپنی کوئی اور شناخت نہ روزِ قیامت چاہتا ہوں نہ اس دنیا میں۔ اور اس حیثیت میں میرے سامنے صرف قرآن کی یہ آیت ہے۔

اے ایمان والوں! عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو بے شک اللہ اس سے باخبر ہے۔ (مائدہ 8:5)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ان اعمال کی توفیق دے جس سے ہم اس کی رضا حاصل کریں۔

والسلام

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (14)

دلائل آخرت: مقصدیت کی دلیل

انسانوں کے یہ تین فطری سوالات ہیں جن کا تسلی بخش جواب کسی مذہب، کسی فلسفے، کسی مصلح اور کسی دانشور کے پاس نہیں۔ یعنی انسان جیسی بامعنی مخلوق کیوں صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے۔ کیوں زندگی کا کمال اور جمال، زندگی کا لطف اور سکون حوادث زمانہ اور انسانی عجز کی نذر ہو جاتا ہے۔ کیوں زندگی عدل، انصاف اور اعتدال سے محروم ہے۔ جب ان سوالات کا جواب نہیں ملتا تو انسان مادیت، رہبانیت یا غفلت و بے حسی جیسے راستوں پر قدم رکھ دیتا ہے۔

رحمٰن کا جواب

اللہ الرحمٰن جو دلوں کے بھید اور ماضی، حال، مستقبل کی ہر چیز سے واقف ہے، اپنی کتاب مبین میں ان سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ اور جب وہ جواب دیتا ہے تو مقصدیت کی وہ دلیل وجود میں آجاتی ہے جو واضح نہ کی جائے تو لوگ اللہ کو مانیں نہ روز آخرت پر ایمان رکھیں۔ یہ دلیل انسانی سینے کی ہر خلش کو مٹاتی، مصائب دنیا کو جھیلنا آسان بناتی اور موت جیسی ناگوار حقیقت کو خوشی خوشی گلے لگانے پر تیار کر دیتی ہے۔

اس دلیل کے کئی پہلو ہیں۔ اس دلیل کا اولین پہلو اس دنیا میں انسانی زندگی کی اصل نوعیت کو واضح کرنا ہے۔ اس سچائی کو بیان کرنا ہے کہ یہ دنیا بے فائدہ اور بے مقصد نہیں بنی، نہ انسان کو بے کار و عبث پیدا کر دیا گیا ہے۔ حیات ہو یا کائنات دونوں ایک باقاعدہ مقصد اور منصوبے کے تحت وجود میں آئے ہیں۔ موجودہ دنیا اور موجودہ دنیا میں رائج قوانین ابدی نہیں بلکہ ایک خاص

مدت تک (الی اجل مسمی ،روم8:30،احقاف 3:46) ہی کارفرما رہیں گے۔اس دنیا میں انسان کو ہمیشہ جینے کے اصول پر پیدا ہی نہیں کیا گیا بلکہ ہر ذی روح کو صفحہ ہستی سے مٹ جانا ہے(رحمٰن26:55)۔لیکن اپنے مٹنے سے پہلے اسے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ یہ دنیا عیش جہاں کا دوام ڈھونڈنے کی جگہ نہیں بلکہ آئندہ آنے والی زندگی کے لیے اچھے اعمال سمیٹنے کی جگہ ہے،(جاثیہ 45:22-21)۔یوں یہ دنیا دارالعمل ہے،دارالجزا نہیں۔دارالجزا تو اس وقت قائم ہوگا جب موجودہ زمین وآسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیے جائیں گے،(ابراہیم48:14)۔

دنیا دارالامتحان ہے

مگر اس دن کے آنے سے پہلے یہ دنیا مقام آزمائش ہے۔یہی اس دلیل کا دوسرا پہلو ہے۔ یعنی یہ عارضی دنیا اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک امتحان گاہ ہے جہاں زندگی اور اس کی تمام نعمتوں سے لے کر موت اور محرومی تک خیر وشر کی ہر شکل دراصل امتحان کی غرض سے پیدا کی گئی ہیں۔یہاں زندگی جو سب سے بڑی نعمت ہے اور موت جو سب سے بڑی مصیبت ہے ان دونوں کے بیچ اچھے برے حالات آتے رہیں گے اور اسی درمیانی عرصے میں انسان کو حسن عمل کی کمائی کرنی ہے(ملک2:67،الانبیا35:21)۔انسان کو نیکی کرنا ہے چاہے اس کا نتیجہ برا نکلے اور برائی سے بچنا ہے چاہے اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلے۔برے حالات میں بھی راہ حق پر گامزن رہنا ہے اور اچھے حالات پا کر بھی سرکش نہیں ہونا یہی اصل امتحان ہے۔یہ امتحان ہو نہیں سکتا جب تک کہ اس دنیا میں محرومی کی وہ ساری شکلیں نہ تخلیق کی جائیں جو نظر آتی ہیں،۔چنانچہ پروبلم آف ایول یا شر کا مسئلہ جس کی وجہ سے دنیا میں سارے شر، دکھ اور آفات موجود ہیں، خدائی منصوبے کا نقص نہیں بلکہ اس کا لازمی حصہ ہے۔محرومی کی ہر شکل،ظلم کی ہر آزادی اور دھرتی پر ہر فساد پر خدا کی بظاہر خاموشی امتحان کا حصہ ہے۔انھی اچھے برے حالات میں دیکھا جاتا ہے

کہ کون حق پر قائم رہتا اور سرکش نہیں ہوتا ہے۔ جب یہ واضح ہوگیا کہ امتحان ہورہا ہے تو پھر لازمی نتیجے کے طور پر یہ ماننا ہوگا کہ سزا و جزا ہوگی۔ یہ امتحان اور اس کا نتیجہ، عمل اور اس کی جزا دونوں لازم وملزوم ہیں۔

اس دلیل کا تیسرا پہلو وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ حیات و کائنات کے بارے میں لوگوں کا زاویہ نظر درست کرکے یہ بتاتے ہیں کہ امتحان کے دوران میں بھی ایسا نہیں کہ یہ دنیا مکمل طور پر دکھ اور محرومی کے اصول پر بنی ہو بلکہ یہ دنیا اصلاً نعمت کے اصول پر بنائی گئی ہے۔ قرآن مجید کی سورہ رحمٰن خاص طور پر اسی حوالے سے لوگوں کا زاویہ نظر درست کرتی ہے اور اس میں ہر قدم پر موجود اللہ کی نعمتوں اور عنایتوں پر توجہ دلا کر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم اس کی کس کس نعمت کا انکار کروگے۔ اس سورت کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں محرومی کا نہیں بلکہ عطا و بخشش کا قانون رائج ہے۔ یہاں ہر درد سے پہلے آرام ہوتا ہے، ہر دکھ سے پہلے سکھ ہوتا ہے۔ ہر بیماری سے پہلے صحت ہوتی ہے۔ درد، دکھ، بیماری وغیرہ تو صحت وسکون کی مستقل حالت کے بیچ میں آنے والے معمولی وقفے ہیں، مگر انسان ان کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے کہ زندگی میں ملی ہزار نعمتوں کو بھول کر کسی ایک آدھ وقتی محرومی کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ جن لوگوں کی زندگی میں مستقل دکھ آجائیں، مثلاً معذوری وغیرہ ایسے پریشان حال لوگوں کی تعداد بڑی محدود ہوتی ہے۔ اور اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی محرومی کے آئینے میں باقی لوگ اپنی نعمتوں کو پہنچانیں۔ باقی جو بیشتر دکھ اس دنیا میں ہیں، اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر نہیں۔ اس نے تو اپنی دنیا نعمت کے اصول پر بنائی خود توازن رکھا ہے اور تمھیں بھی اسی کی تلقین کی۔ مگر جب یہ نہیں ہوتا تو فساد برپا ہوتا ہے۔ مگر ایک دن آئے گا جب اہل باطل کا سر کچل دیا جائے گا اور زمین کا اقتدار ہمیشہ کے لیے اللہ کے نیک بندوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا، (الانبیا21:18،105)۔

چنانچہ اس پہلو سے جب قرآن مجید کی تعلیمات کو دیکھا جاتا ہے تو انسان کبھی مایوسی اور ناشکری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ جبکہ اثبات آخرت کے پہلو سے یہ دلیل ثابت کرتی ہے کہ ایک دار الجزاء ضرور آئے گا۔ کیونکہ جب دنیا کا دار العمل ہونا واضح ہو گیا تو لازمی ہے کہ ایک دار الجزاء کو مانا جائے۔

دلیل مقصدیت اور فطرت کا تعلق

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ دلیل اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک وضاحت اور انداز فکر کی تصحیح ہے۔ اس پہلو سے بظاہر یہ کوئی دلیل نہیں۔ تاہم اس کو جو چیز ایک دلیل بناتی ہے، وہ انسانی فطرت میں دبی ہوئی ایک بے عیب اور اطمینانِ کامل سے بھرپور دنیا کی وہ خواہش ہے جس پر ''فطرت کی دلیل'' کے عنوان سے ہم نے دلائل آخرت کے ضمن میں سب سے پہلے گفتگو کی تھی۔ دلیل مقصدیت کے آغاز پر ہم نے جو تین سوالات اٹھائے تھے وہ انسان کی اسی فطرت سے پھوٹے تھے۔ جبکہ دلیل فطرت کے بیان میں ہم نے یہ واضح کیا تھا کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے ہمیشہ ایک بے عیب دنیا کا خواہش مند رہا ہے اور ہمیشہ اسی کی تعمیر کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جبکہ اس کا ضمیر یہ چاہتا ہے کہ دنیا ہمیشہ عدل کامل ہو۔ وہ اپنی حد تک سزا و جزا کا ایک نظام بنا کر یہ کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، مگر کچھ بھی کر لیا جائے اس دنیا میں عدلِ کامل ممکن نہیں۔ اسی طرح انسانی عجز اور اس دنیا کے مسائل یہاں کبھی اس کی دنیا مطلوب دنیا قائم نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ اس فطری سوال کے جواب قرآن مجید ایک طرف قیامت کے بعد قائم ہونے والی جنت و جہنم کی دنیا کا نقشہ اس کے سامنے رکھ دیتا ہے تو دوسری طرح اس دن کا بھرپور تعارف کراتا ہے جب عدل کامل کیا جائے گا۔

تاہم اس کے بعد یہ سوال بہرحال رہ جاتا تھا کہ پھر اس دنیا کے مسائل کی حقیقت کیا ہے۔ دلیل

مقصدیت اسی دوسرے سوال کا جواب ہے کہ اس دنیا کے سارے مسائل صرف اس لیے ہیں کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔امتحان ہی وہ غایت اور مقصد ہے جس کی بنا پر یہاں کے ہر شر اور مسئلے کو گوارا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں جو کچھ انسان کرے گا اسی کی بنیاد پر اخروی دنیا کی سزا و جزا کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ انسانی عقل اس توجیہ کو جیسے ہی سنتی ہے، وہ فطرت کی اساس پر اس کو فوراً قبول کر لیتی ہیے۔تاہم ایک ڈھیٹ آدمی پلٹ کر یہ سوال کرسکتا ہے کہ اس دنیا کا دارالعمل ہونا چلو مان لیا، مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ آگے کوئی دارالجزاء ہے جس میں سزا جزا ہوگی۔ہم لاکھ کہیں کہ یہ فطرت کی پکار ہے مگر وہ نہ مانے اور یہ کہے کہ یہ تو محض دعوے ہیں، دلیل نہیں۔ چنانچہ آخرت کے لحاظ سے قرآن مجید کے اگلے دلائل اسی اعتراض کے جواب میں ہیں۔تاہم ان پر تفصیلی گفتگو انشاءاللہ آگے ہوگی۔

قرآنی بیانات

قرآن مجید نے متعدد جگہوں پر مختلف طریقوں سے یہ واضح کیا ہے کہ یہ دنیا بامقصد طریقے پر تخلیق کی گئی ہے۔ چند بیانات درج ذیل ہیں۔

اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے۔اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے! بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کر رہے گا اور تمہارے لیے اس چیز کے سبب سے، جو تم بیان کرتے ہو، بڑی خرابی ہے!

(الانبیا21:18-16)

تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بس یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے! (مومنون23:115)

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں اہلِ عقل کے لیے

بہت سی نشانیاں ہیں۔ان کے لیے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار، تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے، سوتو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ (ال عمران 3:191-190)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں کھیل کے طور پر نہیں بنائیں۔ہم نے ان کو نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک مقصد کے ساتھ لیکن ان کے اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔بے شک فیصلہ کا دن ان سب کا وقت موعود ہے۔ (دخان 44:40-38)

کیا انہوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا! اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے نہیں پیدا کیا ہے مگر غایت وحکمت اور ایک مدتِ مقرر کے ساتھ۔اور لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ (الروم 30:8)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر ایک غایت اور معین مدت کے لیے۔اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اس چیز سے اعراض کیے ہوئے ہیں جس سے ان کو آگاہ کیا گیا ہے۔ (احقاف 46:3)

یہ بات کہ موجودہ دنیا نیکی اور بدی کے ارتکاب کی جگہ ہے اور یہی اس کا مقصد ہے اور یہ کہ آنے والی دنیا میں سزا و جزا اسی بنیاد پر برپا ہوگی اس طرح بیان ہوئی ہے۔

کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، ان کی زندگی اور موت یکساں ہو جائے گی؟ بہت ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تا کہ بدلہ دیا جائے ہر جان کو اس کے کیے کا اور ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔

(جاثیہ45:22-21)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں عبث نہیں پیدا کی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا تو ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا دوزخ کی ہلاکت ہے۔کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے زمین میں فساد مچانے والوں کی طرح کر دیں گے، یا ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح بنا دیں گے!! (ص38:28-27)

یہ بات کہ روز قیامت نئے آسمان وزمین بنائے جائیں گے اور زمین اللہ کے نیک بندوں کو دے دی جائے گی اس طرح بیان ہوئی ہے۔

اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور سب اللہ واحد وقہار کے حضور پیش ہوں گے۔ (ابراہیم48:14)

اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔ (الانبیا105:21)

جب کہ موجودہ دنیا کے امتحان گاہ ہونے کو ایسے واضح کیا گیا ہے۔

اس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تا کہ تمہارا امتحان کرے کہ تم میں کون سب سے اچھے عمل والا بنتا ہے۔اور وہ غالب بھی ہے اور مغفرت فرمانے والا بھی ،(ملک2:67)

ہر جان کو موت کا مزہ لازماً چکھنا ہے۔اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں پرکھنے کے لیے اور ہماری ہی طرف تمہاری واپسی ہونی ہے۔ (الانبیا35:21)

[جاری ہے]

دوسرا اصول: حسن ہیئت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے بھائیوں کے پاس آ رہے ہو پس اپنی سواریوں کو ٹھیک رکھو، اپنے لباس سنوارو یہاں تک کہ لوگوں کی آنکھ میں بھلے دکھائی دو بے شک اللہ گندگی کو پسند نہیں کرتا''۔ (ابوداؤد)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا ملاحظہ کیجیے آپؐ نے فرمایا: تم اپنے بھائیوں کی طرف جارہے ہو، پس تم اپنی سواریوں کو درست رکھو، اپنے لباس اچھے رکھو تا کہ لوگوں کی آنکھوں میں بھلے لگو کیوں کہ وہ گندگی کو پسند نہیں کرتے''۔

حدیث کے الفاظ سواری کو درست رکھو سے آج مراد گاڑی کو ٹھیک رکھو، کیوں کہ یہ انسان کا بیرونی گھر ہے، لباس کے اچھا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے انسان دوسروں کی نظر میں بھلا محسوس ہوتا ہے۔ یہ مسلمان کا اپنے رشتوں اور دوستوں کے ساتھ ادب ہے۔ یہ ادب تمام گھر والوں کے ساتھ ہونا چاہیے، عورت کو شوہر اور بچوں کے سامنے مثال ہونا چاہیے اسی طرح مرد کو اپنے گھر والوں میں، اسی طرح ایک گھر میں رہنے والے ہر فرد کا فرض ہے وہ دوسروں کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ کرے، ہر حال میں صاف ستھرا عمدہ لباس پہننا چاہیے ضروری نہیں وہ نیا ہی ہو، ہمارا معاملہ اس فوجی کی طرح ہونا چاہیے جو اپنی وردی کا خاص اہتمام کرتا ہے۔ اور ہر کام ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے سرانجام دیتا ہے۔ وہ تو دنیاداری کے لیے ایسا کرتا ہے۔ جب کہ مومن تو اللہ کا غلام ہوتا ہے اور اس کے رب کا اس کو حکم ہے کہ و ثیابك فطهر ۔ والرجذ فاهجر اور اس کے قائد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم و عمل بھی اس کے سامنے ہوتا ہے پھر بھلا وہ کیسے ان چیزوں سے بے اعتنائی برت سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید کو دیکھا کہ وہ

گندے ہو رہے ہیں اور چھوٹے بچے ہیں تو ان کو صاف کر دیا۔

یہ ام المومنین عائشہ ہیں جو ایک عورت کو نصیحت کرتی ہیں کہ وہ اپنے شوہر کے لیے بنا سنورا کرے۔ اسی طرح ابن عباس نے مرد کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کے لیے خوب صورت لباس پہن کر تیار ہوا کرے۔

ایک آدمی کو گھر اور گھر سے باہر حسن و ادب کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک مسلمان گھرانے میں حسن ترتیب کا اہتمام اس طرح سے ملحوظ رکھنا چاہیے:

☆ گھر کی ہر چیز ایک ترتیب اور سلیقے سے رکھی جائے' سونے سے بیدار ہونے کے بعد یا گھر میں کام کے بعد چیزوں کو اسی طرح نہ پھینک دیا جائے بلکہ ان کو اپنے مقام پر واپس رکھ دیا جائے۔

☆ ایک وقت میں بہت سارے کام نہ کھول لیں بلکہ اہمیت و ضرورت کے اعتبار سے ایک کے بعد دوسرا کام کریں۔

☆ سونے کا کمرہ ہو یا مہمانوں کا' کتاب خانہ ہو یا باورچی خانہ ہر ایک کو اپنے حساب اور ضرورت سے ترتیب دیں۔

☆ میز پر کتابیں اور کاپیاں سلیقے اور ترتیب سے رکھی جائیں۔

☆ نیند سے بیدار ہونے کے بعد رات کے لباس کو اتار کر لٹکایا جائے نہ کہ ادھر ادھر پھینک دیا جائے یہی عادت بچوں کو ڈالی جائے۔

☆ ہر چیز میں ترتیب و تنظیم ملحوظ رکھی جائے۔ مثلاً کتب وغیرہ کو۔ اس ضمن میں بہت اہم مسئلہ سونے کا ہے اور خاص طور پر چھوٹے بچوں کا ان کو سلاتے وقت لڑکے اور لڑکی کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ کام دینی و دنیاوی اور صحت کے اصولوں کی ادائیگی کو مدِ نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔

[جاری ہے]

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (18)

ترکی کی پہلی صبح

اب رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اب جا کر کہیں عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم ہوٹل پہنچے اور جلد سے جلد سونے کی کوشش کی۔ آج ہمارے سفر کا پہلا دن تھا اور ہم صبح پانچ بجے سے جاگ رہے تھے۔ نیند جلدی آ گئی۔

صبح چار بجے ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ترکی میں گرمیوں کی راتیں بہت مختصر ہوتی ہیں۔ اگر مزید شمال کی طرف چلا جائے تو یہ راتیں اور بھی مختصر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ سردیوں میں اس کے الٹ معاملہ ہوتا ہے اور دن بہت ہی مختصر ہو جاتے ہیں۔ چند دن گزارنے کے بعد یہ عجیب رواج سامنے آیا کہ یہاں کھڑکیوں پر بہت ہی ہلکے سے پردے لگائے جاتے تھے۔ اس وجہ سے نماز کے بعد یہاں سونا ایک مشکل کام لگ رہا تھا۔

ناشتہ کمرے کے کرائے میں شامل تھا۔ ہم لوگ نیچے ہال میں ناشتہ کرنے پہنچے۔ ناشتہ بوفہ اسٹائل کا تھا۔ ایک جانب پنیر کے قتلے تھے۔ دوسری طرف ابلے ہوئے انڈے رکھے ہوئے تھے۔ تیسری طرف شہد، پنیر اور مکھن کے ننھے منے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ چوتھی طرف کھیرے اور ٹماٹر کاٹ کر رکھے گئے تھے۔ ہمارے پنجاب کی بڑی بوڑھیوں کے خیال میں کبھی بھی خالی پیٹ کچی سبزی نہیں کھانی چاہیے مگر یہاں ایسا ہی رواج تھا۔ میں نے ماریہ کے لئے آملیٹ لانے کا کہا مگر ویٹر صاحب اس لفظ سے ہی ناواقف تھے۔ وہ ہوٹل کے منیجر کو بلا لائے جن کا معاملہ ویٹر سے مختلف نہ تھا۔

روٹی کے طور پر عجیب و غریب قسم کے بن سامنے آئے۔ ترکی میں روٹی کے طور پر یہ بن

کھانے کا رواج تھا۔ اندر سے تو یہ نرم تھے مگر ان کا چھلکا نہایت ہی سخت تھا۔ اگر چھلکے کو اتار کر بن کھایا جاتا تو ایک پیس کا ایک ہی نوالہ بنتا۔ میں نے چھلکے کو چبانے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر میں یہ منہ میں گھل گیا مگر اس کوشش میں میرے جبڑوں میں کچھ درد ہونے لگا۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بن کا یہ چھلکا کسی درخت کی چھال سے بنایا گیا ہے۔ اب مجھے محمد کی حیرت کی وجہ سمجھ میں آئی کہ پاکستانی روزانہ روٹی بناتے ہیں۔ روزانہ صبح، دوپہر اور شام کے کھانے میں چند دن یہ بن کھانے سے میری داڑھ میں مستقل درد ہو گیا جو کافی عرصہ بعد جا کر ٹھیک ہوا۔

ییدی گولر

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم باہر نکلے۔ رات والی شاورما کی دکان سے ماریہ کے لئے چکن کے نگٹ بنوائے۔ اب ہم ییدی گولر جانے کے لئے تیار تھے۔

بولو کے گرد و نواح میں دیکھنے کی بہت سی جگہیں تھیں مگر سب کو دیکھنا ممکن نہ تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہر شہر کے ایک دو قابل دید مقامات کی سیر کر لی جائے۔ بولو کے گرد و نواح میں سب سے خوبصورت جگہ ییدی گولر تھی۔ ترکی میں ییدی سات کو کہتے ہیں اور گول یا گولر جھیل کو۔ یہ سات جھیلوں کا مجموعہ تھا جو گھنے سبزے سے ڈھکے پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔

بولو سے باہر نکل کر ہم ان کے جی ٹی روڈ کے مرکزی چوک میں پہنچے اور ییدی گولر والی سڑک پر چل پڑے۔ تھوڑی دور جا کر پختہ سڑک ختم ہو گئی۔ اب ہم ایک کچی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ یہاں ہر سال سردیوں میں بہت زیادہ برفباری ہوتی ہے۔ بولو کے قریب بہت سے اسکائی انگ ریزارٹ بنے ہوئے ہیں۔ برف باری کی وجہ سے یہاں پختہ سڑک کا قائم رہنا مشکل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کی حکومت نے پختہ سڑک کا تکلف ہی نہیں کیا۔ کچی سڑک البتہ بالکل ہموار تھی اور یہاں جیپ کی ضرورت نہیں تھی۔

کچھ دور جا کر ہم پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔ اب دونوں جانب پہاڑ ہمیں اپنے جلو میں لیتے ہوئے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ درمیان میں پتلی سی وادی تھی جس میں بس یہی سڑک بنی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ ہم اوپر کی جانب جا رہے تھے۔ سڑک کو اتنے اچھے انداز میں پلان کیا گیا تھا کہ گاڑی با آسانی تیسرے گیئر میں چل رہی تھی۔

پہاڑوں کے اوپر اتنی ہریالی تھی کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں مویشی چرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دور پہاڑ پر سبز پودوں میں ایک سرخ پودا بھی نظر آ رہا تھا۔ ابھی جولائی کے آخری ایام تھے۔ اس نے کچھ جلدی کر دی تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد ان سب پودوں کے پتوں کو سرخ اور پھر سیاہ پڑ جانا تھا۔

اللہ تعالی نے یہ ایکو سسٹم بھی خوب بنایا ہے۔ زمین سے نمکیات چوس کر یہ پودے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے پتے کھا کر جانور پلتے ہیں اور جانوروں کو انسان کھا جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ پودے، جانور اور انسان جب مر کر مٹی میں ملتے ہیں تو دوبارہ ان نمکیات کو پورا کر دیتے ہیں جن کی ضرورت پودوں کو ہوتی ہے۔ دنیا کا یہ نظام انتہا درجے کی ذہانت کی تخلیق ہے۔ اس زمین کا ذرہ ذرہ یہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ اسے لامحدود ذہانت کی حامل کسی ہستی نے تخلیق کیا ہے۔ اس کائنات میں صرف انسان ہی ایسی ناشکری مخلوق ہے جو اپنی خواہشات کو بے لگام کرنے کے لئے خالق کائنات کا انکار کر دیتا ہے ورنہ ہر مخلوق اس کے حکم کے آگے سربسجود ہے۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو ایک تین پروں والی پن چکی ہمارے سامنے تھی۔ یہ بجلی پیدا کرنے کے لئے تھی اور یہاں سے تاریں نکل کر دونوں طرف جا رہی تھیں۔ یہ بجلی پیدا کرنے کا سستا اور آسان طریقہ تھا۔ نجانے ہمارے ہاں اسے کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ توانائی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اللہ تعالی نے ہمارے لئے بے پناہ توانائی مفت ہوا، پانی اور دھوپ کی

صورت میں رکھ دی ہے۔اس سے فائدہ نہ اٹھاتے ہوئے مہنگی تھرمل بجلی پیدا کرنا اللہ تعالی کی ناشکری ہے۔

پہاڑ چنار کے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہمارے شمالی علاقہ جات میں پہاڑوں پر یہی چنار کے درخت سایہ کرتے ہیں مگران کا پھیلاؤ اتنا زیادہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اگر پہاڑ کی گھاس زرد ہو جائے تو اس کا سبزہ کم محسوس ہوتا ہے۔ یہاں کے چنار کے درخت بہت پھیلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے پہاڑ گھنے سبز نظر آ رہے تھے۔

ایک دو مقام پر دوراہے تھے۔ یہاں سے پوچھ کر ہم درست سمت میں چلے۔سڑک اب نیچے اتر رہی تھی۔تھوڑی دیر میں ہم ییدی گولر جا پہنچے۔اس علاقے کو ترکی کی حکومت کی جانب سے نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا تھا۔سڑک کے دونوں جانب جھیلیں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس اور ایک کیبن بنا ہوا تھا۔ میں نے گاڑی ایک جانب پارک کر دی۔کیبن میں سے ایک صاحب نکلے۔ میں نے ان سے اس مقام کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے بیزاری سے ترکی زبان میں ایک تقریر کر دی۔ زبان کا تو ایک لفظ بھی پلے نہ پڑا مگران کے اشاروں کا خلاصہ کچھ یوں سمجھ میں آیا کہ یہ دوسری اور تیسری جھیل ہے۔پہلی جھیل اوپر کی جانب تھی اور بقیہ نیچے کی جانب۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

چاہت کا تسلسل

اپنے امکان کی حد سے بڑھ کر
اپنے محبوب کی چاہت کرنا
اتنا آسان نہیں ہوتا ہے
خانہء جاں میں دیا جلتا ہے دھیرے دھیرے
یہ وہ گوشہ ہے جو ویران نہیں ہوتا ہے
اس کی خوشبو میری سانسوں میں بسی رہتی ہے
دور رہ کر بھی کبھی دور نہیں رہتا ہے
پاس آتا ہے کبھی رقصِ صبا کی صورت
موجہءِ گل کی طرح سے کبھی لہراتا ہے
کبھی ہونٹوں پہ غزل بن کے مہک جاتا ہے
کبھی ہاتھوں پہ حِنا بن کے لپٹ جاتا ہے
اُس کی چاہت نے سکھائے مجھے جینے کے چلن
میں نے انساں سے محبت کے قرینے سیکھے
میں نے مجبوروں کی، بیواؤں کی غم خواری کی
میں نے کمزوروں کے، محروموں کے آنسوں پونچھے
جب بھی دُکھ بانٹنے لگتی ہوں میں ناداروں کے
ان کی آنکھوں میں دیئے پیار کے جل جاتے ہیں

رنگ چہروں پہ خوشی بن کے سمٹ آتے ہیں
غم کے سائے میرے اطراف سے ہٹ جاتے ہیں

اُس کے بندوں سے کوئی پیار اگر کرتا ہے
اُس کو اللہ بھی محبوب بنالیتا ہے
یوں گزرتا ہے وہ کانٹوں کی گزرگاہوں سے
اُس کے دامن کو گناہوں سے بچالیتا ہے

تیرے بندوں سے بہت پیار کیا ہے میں نے
ہوں گنہ گار یہ اقرار کیا ہے میں نے
لِمن الملک[1] کی آئے گی صدا محشر میں
میں یہ کہہ دوں گی کہ بے شک ہے حکومت تیری
میرے ہر جرم پہ حاوی ہے سخاوت تیری
مالِکُ الملک تھا دنیا میں تو ہی
آج بھی ہے
بخش دے اے میرے مولیٰ !
کہ تیرا راج بھی ہے

\-

[1] یعنی آج بادشاہی کس کی ہے۔

رحمان کے بندوں کی خصوصیات

''خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔

اور جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔

اور جو دعائیں کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اس کا عذاب تو چمٹ جانے والی چیز ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے''۔

اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

اور جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں...... یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کے عذاب میں درجہ بدرجہ اضافہ کیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے......

(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو کسی باطل میں شریک نہیں ہوتے۔

اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

اور جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے۔

اور جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا''...... یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام'' (الفرقان 25:63-76)